IMPACT FACTOR
5.473 (SJIF)

UPA NATIONAL E-JOURNAL
Interdisciplinary Peer-Reviewed Indexed Journal

ISSIN
2455-4375

منٹو کے افسانوں میں نسائی احساس

Manto k Afsano m nisai ehsaas

Dr. Azhar Abrar Ahmad Dept. (Urdu)

Seth Kesarimal Porwal College Of Arts & Science & Commerce Kamptee Dist .Nagpur

Email. azhar_abrar@rediffmail.com

Mobile No: 9970284175

سعادت حسن منٹو کا نام آتے ہی ہمارے ذہن میں ایک ایسے افسانہ نگار کا واضح خاکہ ابھر آتا ہے جسے ہمیشہ اردو زبان کا ایک متنازعہ افسانہ نگار سمجھا گیا ہے۔ اور ادبی دنیا کے نقاد آج بھی اپنے اپنے نقطہ نظر سے اپنی نقد آراء پیش کرتے رہتے ہیں جس میں کبھی منٹو فحش نگار بن کر ابھرتا ہے تو کبھی عظیم افسانہ نگار۔ ان میں سے کسی کو یہ بات برابر کھٹکتی ہے کہ وہ منٹو کے افسانوں میں سوائے عریانیت کے کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن وہ نام نہاد نقاد پر کسی قسم کی سخت تنقید نہیں کر پاتے جس کی اہم وجہ منٹو کے افسانوں میں موجود وہ ماحول ہوتا ہے وہ کردار ہوتے ہیں اور وہ حالات جس میں رہ کر منٹو پورے افسانے کا پلاٹ تیار کرتا ہے ایک ایک بات کو بڑے نپے تلے انداز میں پیش کرتا ہے اور اپنے کرداروں کو اسی طرح پیش کرتا ہے جیسے وہ ہیں اگر کوئی شرابی ہے تو شرابی ہے نہ اسے نیک پارسا بنانا چاہتا ہے اور نہ کسی مولوی کو بدکردار ۔منٹو نے اپنے افسانوں کا مواد اس ماحول سے بھی لیا جہاں اچھے اچھے افسانہ نگار قلم اٹھانے سے بھی ڈرتے ہیں۔ منٹو نے بہت سارے افسانے فسادات پر بھی لکھے۔ منٹو کے افسانے اتنے مربوط ہوتے ہیں کہ پھر اس بات میں شک نہیں رہ جاتا کہ منٹو محض فحش نگار ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح سے عورت کی بے بسی کو پیش کر دیتا ہے آج جو عورت بظاہر بازار میں بیٹھی نظر آتی ہے اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی مجبوری ضرور ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ بازار تک چلی آئی۔ منٹو کے افسانوں میں معاشرے کی ان عورتوں کا ذکر ملتا ہے جو حالات کے ہاتھوں تنگ آ کر کسی بازار کی زینت بن جاتی ہیں اور پھر سارے زمانے کے لیے وہ کسی دھبہ سے کم ثابت نہیں ہوتیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منٹو سے پہلے اتنی شدت کے ساتھ نہ کسی نے ایسی تحریریں لکھی تھیں نہ اب کوئی لکھتا ہے اس بات کا جواب خود اپنے ایک مضمون میں اس طرح دیتا ہے ۔''میں کیوں لکھتا ہوں''؟

'یہ ایک ایسا ہی سوال ہے کہ میں کیوں کھاتا ہوں؟ میں کیوں پیتا ہوں؟ لیکن اس لحاظ سے مختلف ہے کہ کھانے اور پینے پر روپے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور جب لکھتا ہوں تو مجھے نقدی کی صورت میں کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ لیکن جب گہرائی میں جاتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ فاقہ کشی کی حالت میں دماغ چلتا رہے گا۔ مگر ہاتھ کا چلنا تو ضروری ہے۔ ہاتھ نہ چلے تو زبان ہی چلنی چاہیے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ انسان کھائے پیے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ لوگ فن کو اتنا اونچا رتبہ دیتے ہیں۔ اس کے ڈانڈے ساتویں آسمان سے ملا دیتے ہیں۔ مگر یہ کیا حقیقت نہیں ہے کہ یہ ارفع و اعلیٰ شے ایک سوکھی روٹی کی محتاج ہے:

میں لکھتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے کچھ کہنا ہوتا ہے۔ میں لکھتا ہوں۔ اس لیے کہ میں کچھ کما سکوں۔ تاکہ میں کچھ کہنے کے قابل ہو سکوں۔ روٹی کا اور فن کا رشتہ بظاہر کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ خداوند تعالیٰ کو یہی منظور ہے۔ وہ خود کو ہر چیز سے بے نیاز کہتا ہے۔ وہ غلط ہے۔ وہ بے نیاز، وہ بے احتیاج کچھ بھی نہیں ہے ۔ ہرگز نہیں ہے۔ اس کو عبادت چاہیے اور عبادت بڑی ہی نرم و نازک روٹی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ چپڑی ہوئی روٹی ہے۔ جس سے وہ اپنا پیٹ بھرتا ہے۔

سعادت حسن منٹو لکھتا ہے۔اس لیے کہ وہ خدا جتنا بڑا افسانہ ساز اور شاعر نہیں۔یہ اس کا عجز ہے جو اس سے لکھواتا ہے۔''

افسانہ''وہ لڑکی'' میں لڑکی کہتی ہے تمھارے پاس پستول ہے اور یہی سے افسانے کا رخ بدل جاتا ہے۔جس میں منٹو بڑی ذمہ داری کے ساتھ لڑکی کے احساس کو جگا دیتا ہے جو بظاہر ایک معمولی غریب اور در در کی ٹھوکریں کھانے والی نظر آتی ہے لیکن وہ جس انداز میں سریندر کے گھر میں داخل ہوتی ہے اور اپنا بدلہ لینے کے لیے خود اپنا استحصال کرواتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کیسے اپنے والد کا بدلہ لینے کے لیے بے قرار ہے وہ سریندر سے انتقام لینے کے لیے اس کی پستول حاصل کر لیتی ہے اور یہ جملہ کہتی ہے''وہ مسلمان میرا باپ تھا''

اس افسانے کو بغور پڑھنے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ منٹو نے اس لڑکی کے احساس محرومی کو ایک ایسی شکل دے دی ہے جس کے لیے وہ لڑکی اپنے باپ اور بھائیوں کے قتل کا بدلہ لینے پر آمدہ ہو جاتی ہے اور سریندر کو آخر تک احساس بھی نہیں ہوتا لیکن موت سے پہلے جب اس پر حقیقت واضح ہوتی تو وہ سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں کر سکتا۔منٹو کے بیشتر افسانوں کی یہی خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ بظاہر ابتداء میں ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ سارا ماحول پر سکون نظر آتا ہے لیکن افسانے کے خاتمہ پر قاری ایک گہرا جھٹکا محسوس کرتا ہے۔

افسانہ' کھول دو' جیسے منٹو کی پہچان بن چکا ہے اس کے بارے میں خوب واویلا مچا نقادوں میں کہرام مچ گیا حکومت نے اس افسانے پر منٹو کو عدالت بلایا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسا ماحول تیار کیا گیا کہ منٹو کو فحش نگار کہا جانے لگا۔اس بابت یوسف سرمست نے اپنے اس مضمون میں' کھول دو' پر بھی بحث کی ہے اور اس کہانی کی دردنا کی بیان کرنے کے لیے شکیل الرحمن کے الفاظ کا سہارا لیا ہے:

''کھول دو' ایک انتہائی تکلیف دہ اور اذیت ناک المیہ ہے۔فسادات کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں میں اتنا تکلیف دہ اور اذیت ناک المیہ خلق نہیں ہوا۔فن کار کا مشاہدہ کتنا تیز اور باریک ہے اور اس کا وژن کتنا روشن اور گہرا ہے اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔اس چھوٹی سی کہانی میں سنگین واقعات اور تجربات کے پس منظر اور تسلسل میں ایک واقعہ کے صرف ایک رخ کو پیش کیا گیا ہے اور وہی رخ اذیت کے نجانے کتنے لمحوں سے آشنا کر دیتا ہے۔''

'کھول دو' میں سکینہ کا کردار منٹو نے کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ نسائی احساس پوری طرح سے اجاگر ہو گیا ہے اور فسادات کے دوران وہ لوگ جو اپنے چہروں پر ہمدردی کا نقاب اوڑھے ہوئے تھے۔بے نقاب ہو گئے وہ خود کو رضا کار کہتے تھے وہ بھی درندے نکلے اور انھوں نے سکینہ کے باپ سے وعدہ کیا کہ وہ اسے ڈھونڈ لائیں گے لیکن انھوں نے اس لڑکی کا یہ حال کیا کہ اس کی عصمت لوٹ لی۔ان تمام حالات کا لڑکی پر یہ اثر ہوا کہ وہ گہرے صدمے میں چلی گئی اور ہسپتال میں بھی محسوس کرنے لگی کہ ابھی بھی وہ ان حوص پرستوں کی قید میں ہے۔منٹو نے بڑی ہی چابکدستی سے اس لڑکی کے حالات پیش کیے اور فسادات کے دوران رضا کاروں کی وحشت کو سامنے لایا۔

اس افسانے کے متعلق پروفیسر وہاب اشرفی کہتے ہیں کہ''

منٹو کے یہاں ایک دیدۂ بینا ہے جو سماج کے آر پار دیکھ لیتا ہے۔اس طرح سچی حقیقت نگاری کوئی نہج ہو سکتی ہے تو وہ منٹو کے افسانے میں قطعی طور پر واضح ہے۔فکر کو فن بنانے میں منٹو اپنی مثال آپ ہے۔اس کے یہاں الفاظ ضائع نہیں کیے جاتے،واقعات تھوپے نہیں جاتے،سب کے لیے ایک فطری جگہ ہے اور افسانہ اپنے پاؤں پر چلتا ہوا ایک اختتام پہ پہنچتا ہے جس میں فن کار کی ساری فنی قوت جائز طور پر استعمال ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔''

افسانہ''جاؤ حنیف جاؤ' ایک کمسن لڑکی سمتری کے ساتھ اس کے جیجا نے جو کیا وہ انتہائی قابل مزمت بات ہے اور منٹو نے اس افسانے میں ایک ایسی لڑکی کی زندگی کا سچ پیش کیا جو حنیف سے سچی محبت کرتی تھی اور جس کی بہن دق کے مرض میں مبتلا تھی اس کی سمتری نے پوری طرح خدمت کی لیکن اس کا جیجا جو حوس پرست نکلا اور جس نے اپنی سالی سمتری کی عصمت لوٹ لی۔

اس افسانے کو بغور پڑھنے کے بعد منٹو کی فن افسانہ نگاری پر گرفت سمجھ میں آتی ہے کہ کیسے اس نے نسائی احساس کو پیش کیا افسانے کے آخری جملے تو ایسے کہ دل پسیج جاتا ہے گویا کسی نے ہمارے جذبات،احساسات اور امیدوں کو نچوڑ ڈالا ذرا یہ سطریں دیکھیے

''وہ مرگئی،پر میں اس کا غم نہیں کر سکتی۔میں خود مر چکی ہوں۔میں اس کا مطلب نہ سمجھا۔تم کیوں مرو۔تمہیں تو میرا جیون ساتھی بننا ہے۔یہ سن کر وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔جاؤ حنیف جاؤ۔میں اب کسی کام کی نہیں رہی۔کل رات۔کل رات بابو جی نے میرا خاتمہ کر دیا۔میں چیختی۔ادھر دوسرے کوارٹر سے جیجی چیخی اور مرگئی۔وہ سمجھ

گئی تھی۔ ہائے، کاش میں نہ چیختی ہوتی۔ وہ مجھے کیا بچا سکتی تھی۔ جاؤ حنیف جاؤ۔ یہ کہہ کر وہ اٹھی، دیوانہ وار میرا بازو پکڑا اور گھسیٹتی باہر لے گئی۔ پھر دوڑ کر کوارٹر میں داخل ہوئی اور دروازہ بند کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ حرامزدہ کندن لال آیا۔ اس کے ساتھ چار پانچ آدمی تھے۔ خدا کی قسم اکیلا ہوتا تو میں پتھر مار مار کر اسے جہنم واصل کر دیتا۔ بس یہ ہے میری کہانی۔ سمتری کی کہانی جس کے یہ الفاظ ہر وقت میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں جاؤ حنیف جاؤ۔ کس قدر دکھ ہے ان تین لفظوں میں۔

حنیف کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا: ''جو ہونا تھا، وہ تو ہو گیا تھا۔ تم نے سمتری کو قبول کیوں نہ کیا؟''

حنیف نے آنکھیں جھکا لیں۔ خود کو ایک موٹی گالی دے کر اس نے کہا: ''کمزوری۔ مرد عموماً ایسے معاملوں میں بڑا کمزور ہوتا ہے۔ لعنت ہے اس پر۔''

سمتری کا احساس محرومی اور حنیف کا پچھتاوا بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایسے حالات آج بھی بہت ساری لڑکیوں کے ساتھ پیش آتے ہیں جب کوئی اپنا ہی انھیں لوٹ لیتا ہے اور وہ چاہ کر بھی آہ تک نہیں کر سکتے۔ منٹو نفسیات شناس تھا وہ جانتا تھا کہ کس انسان کی فطرت کیسی ہے لہٰذا اسی لیے وہ مختلف مزاج رکھنے والے انسانوں کی سوچ کو بڑے ہی فطری انداز میں پیش کرتا چلا گیا۔ وہ جانتا ہے کہ مرد محبت کے معاملے کمزور ہوتا ہے اور وہ ایسی لڑکی سے محبت کرنا چاہتا ہے جسے اس کے علاوہ اور کوئی نا چاہے لیکن جب اس کی محبت داغ دار ہو جاتی ہے تو وہ بزدلی کے ساتھ اپنی زندگی میں لوٹ جاتا ہے۔ اسی بات کو منٹو نے حنیف کے کردار میں پیش کیا اور بتایا کہ حنیف نے سمتری کو چھوڑ کر پچھتاوے کی آڑ میں اپنا دامن چھڑا لیا۔ اور شاید اس افسانے کا اختتام اس سے بہتر بھلا کیا ہو سکتا تھا۔

افسانہ 'جانکی' میں منٹو نے اس عورت کا خاکہ کھینچا ہے جو بیک وقت معشوقہ بھی ہے، ایک ذمہ دار عورت بھی ہے ایک اچھی دوست بھی ہے اور زندگی کی رنگ رلیوں میں ملوث بھی ہے۔ یہ ایک ایسی عورت ہے جو جینا چاہتی ہے زندگی میں خوشیاں لانا چاہتی ہے اور بالی ووڈ کی ایک کامیاب ہیروئین بننا چاہتی ہے۔ جو ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتی ہے اور اپنے آس پاس موجود لوگ جیسے منٹو، نرائن، سعید اور عزیز سے وفاداری بھی نبھاتی ہے وہ سعید کو دل دے بیٹھتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے اس کے عشق میں گرفتار ہوتی چلی جاتی ہے لیکن جب سعید کا اس سے دل بھر جاتا ہے تو وہ جانکی سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے لیکن ایسے حالات میں بھی جانکی اسے کی تیمار داری کرتی ہے اس کا برا برخیال رکھتی ہے لیکن جب سعید اس کا دل توڑ دیتا ہے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے بیمار پڑنے کے بعد برونکائٹس ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ نمونیہ کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں نرائن کا کردار کو پیش کیا گیا جو جانکی کو انجکشن دے کر اس کی جان بچاتا ہے۔

ایک مقام پر جب جانکی کو سعید کی حالت معلوم ہوتی ہے تو وہ جلد بازی میں ٹرین سے گر پڑی دیکھیے یہ پیراگراف۔ ''پانچ چھ دنوں کے بعد نرائن کا تار آیا 'ایک ضروری کام ہے، فوراً بمبئی چلے آؤ، میرا خیال تھا کہ کسی پروڈیوسر سے اس نے میرے کنٹریکٹ کی بات کی ہوگی، لیکن بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا کہ جانکی کی حالت بہت نازک ہے۔ برونکائٹس بگڑ کر نمونیا میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ پونہ سے بمبئی پہنچی تھی تو اندھیری جانے کے لیے چلتی ٹرین میں چڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے گر پڑی تھی جس کے باعث اس کی دونوں رانیں بہت بری طرح چھل گئی تھی۔''

جانکی افسانہ پڑھنے کے بعد قاری یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ جانکی کا بلند کردار کس جگہ ہے کیا وہ گھر میں رہ کر منٹو جانکی کو وہ مقام دلا سکتا تھا جو آج اسے اس چمک دمک والی دنیا میں نصیب ہوا۔ اور اس نے انسانیت کی وہ مثال قائم کر دی جو بہت سے باعزت گھرانوں کی خواتین بھی جس سے اکثر محروم رہتی ہیں۔

بھلے ہی آج بھی ادبی نقاد منٹو کو وہ مقام نہ دے سکے لیکن آج منٹو کے افسانے دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکے ہیں اور منٹو کے قارئین کی تعداد لاکھوں میں پہنچ چکی ہے۔ ایک جگہ منٹو لکھتا ہے ''مجھے مقام کی تلاش ہے'' میں

مجھے آپ افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں اور عدالتیں ایک فحش نگار کی حیثیت سے، حکومت کبھی مجھے کمیونسٹ کہتی ہے اور کبھی ملک کا بہت بڑا ادیب۔ کبھی میرے لیے روزی کے دروازے بند کیے جاتے ہیں، کبھی کھولے جاتے ہیں۔ کبھی مجھے غیر ضروری انسان قرار دے کر ''مکان باہر'' کا حکم دیا جاتا ہے اور کبھی موج میں آ کر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ تم ''مکان اندر'' رہ سکتے ہو۔ میں پہلے سوچتا تھا۔ اب بھی سوچتا ہوں کہ میں کیا ہوں اس ملک پاکستان میں جسے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کہا جاتا ہے۔ میرا کیا مقام ہے؟ میرا کیا مصرف ہے؟

آپ اسے افسانہ کہہ لیجیے مگر میرے لیے یہ تلخ حقیقت ہے کہ میں ابھی تک خود کو اپنے ملک میں۔۔ جسے پاکستان کہتے ہیں اور جو مجھے بہت عزیز ہے۔ میں اپنا صحیح مقام تلاش نہیں کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ میری روح بے چین رہتی ہے۔ یہی وجہ وجہ ہے کہ میں کبھی پاگل خانے میں اور کبھی ہسپتال میں ہوتا ہوں۔

میں کچھ بھی ہوں۔ بہر حال مجھے اتنا یقین ہے کہ میں انسان ہوں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مجھ میں برائیاں بھی ہیں اور اچھائیاں بھی۔ میں سچ بولتا ہوں اور بعض اوقات

جھوٹ بھی بولتا ہوں۔نمازیں نہیں پڑھتا لیکن سجدے میں نے کئی دفعہ کیے ہیں۔کسی زخمی کتے کو دیکھ لوں تو گھنٹوں میری طبعیت خراب رہتی ہے۔لیکن مجھے ایسا توفیق نہیں ہوئی کہ میں اسے اٹھا کر گھر لے جاؤں اور اس کا علاج معالجہ کروں۔کسی دوست کو مالی مشکلات ہوتی تھی مجھے کسی اپاہج لڑکی سے ملنے کا اتفاق ہوا تو میرے دل و دماغ میں طوفان برپا ہو جاتا ہے۔میں اپاہج بن کر اس کی جگہ اختیار کر کے گھنٹوں سوچتا ہوں۔اس کی زندگی کے المیہ کے متعلق غور و فکر کرتا ہوں۔پھر تہیہ کرتا ہوں کہ میں اس سے شادی کرلوں گا یہ تہیہ فوراً غائب ہو جاتا ہے جب میں اس کا ذکر اپنی بیوی سے کرتا ہوں۔

میں افسانہ نگار ہوں۔میرے تخلات کی پرواز بہت اونچی ہے لیکن افسوس ہے کہ اونچا اڑ کر پھر ایسا گرتا ہوں کہ پاتال کی انتہائی گہرائی تک پہنچ جاتا ہوں اور وہاں اوندھے منہ پڑا سوچتا ہوں کہ جب گرنا ہی تھا تو اڑنے کا تکلف ہی کیوں کیا؟ لیکن شاید چھوٹے چھوٹے حادثے جو ہم چھوٹے بندوں کی لغزشوں کے باعث ظہور پذیر ہوتے ہیں، مجھے بے حد متاثر کرتے ہیں۔

میں ایک بڑا ادیب ہوں۔میں ایک بڑا انسان ہوں۔لیکن آج تک نہیں سمجھ سکا کہ میرا کیا مقام ہے؟

منٹو کا افسانہ 'مس مالا' عظیم اور بھٹساوے جو فلم انڈسٹری میں کام کرتے ہیں ان کے درمیان مس مالا کو لے کر جو بات ہوئی اور کرشنا جو ایک مراٹھی لڑکی ہے۔بہت ہی اچھے انداز میں فلمی دنیا کا سچ بیان کیا ہے جہاں سیکس عام ہے،فحاشی عام ہے اور ہر طرح کی برائی کا دور دورہ ہے وہاں مس مالا کا کردار پیش کیا جو پیسے سے ایک گانے والی ہے جس پر بھٹساوے کا دل آجاتا ہے اور جب ان دونوں دوستوں کو سیٹھ کی جانب سے روپے ملتے ہیں تو یہ موج مستی کرنے نکل پڑتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک باغ میں اپنی خوشی مناتے ہیں پھر جب وہ ایک ہوٹل میں پہنچتے ہیں تو وہاں ایک کمرے میں عظیم کرشنا کے ساتھ چلا جاتا ہے اور بھٹساوے مس مالا کے ساتھ۔لیکن اس کے بعد کی کہانی بھٹساوے کے لیے پریشانی بھری ہے مس مالا اسے وہ سب کچھ کرنے نہیں دیتی جس کا اسے شوق ہے اور اسے اپنا بھائی بنا کر چلی جاتی ہے۔اب ہم اس افسانے پر غور کرتے ہیں تو مس مالا کا کردار سامنے آتا ہے جو ایک ہمدرد بھی ہے اور مددگار بھی۔اور ساتھ ہی اپنے شوہر کی وفادار بھی۔جو بھٹساوے کو وہ سب کچھ نہیں کرنے دیتی جس کے لیے وہ بے قرار ہے ادھر عظیم کرشنا کو پہلے پہل نصیحت کرتا ہے لیکن جب وہ اس سے لپٹ جاتی ہے تو پھر وہ بھی محبت کے سمندر میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔اس افسانہ کے یہ اقتباس ملاحظہ ہو جہاں بھٹساہے غصہ میں ہے ''بعد میں وہ بڑا نادم ہوا۔کمرے سے باہر نکلا تو بھٹساوے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔کچھ اس انداز سے جیسے بھڑوں کے پورے چھتے کے ڈنک اس کے جسم میں کھبے ہوئے ہیں۔عظیم کو دیکھ کر وہ رک گیا۔مطمئن کرشنا کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور پیچ و تاب کھا کر عظیم سے کہا: ''وہ سالی چلی گئی۔''

عظیم جو اپنی ندامت میں ڈوبا تھا چونکا: ''کون؟''

''وہی۔مالا''

''کیوں''؟

بھٹساوے کے لہجے میں عجیب و غریب احتجاج تھا: ''ہم اس کو اتنا وقت چومتا رہے۔جب بولا آؤ تو سالی کہنے لگا تم ہمارا بھائی ہے''ہم نے کسی سے شادی کر لی ہے''اور باہر نکل گئی۔کہ وہ سالا گھر میں آ گیا ہوگا۔

حوالاجات:

1- سہ ماہی بھاشا سنگم اکتوبر ۲۰۱۵ تا مارچ ۲۰۱۶
2- ماہنامہ 'شاعر' دسمبر ۲۰۱۲
3- 'ایوان اردو' فروری ۲۰۱۳
4- کلیات منٹو جانکی،افسانے
5- کلیات منٹو ممی افسانے